Fikr-o-Nasar vol.1:3-4 (1963)© rasailojaraid.com

اسلام اور دیگر مذاہب فکر

پروفیسر محمد مبارک

آج ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جس میں مختلف مذاہب اور مختلف تہذیبیں ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہی ہیں۔ ایسے ادوار میں عموماً یہی ہوا کرتا ہے کہ بہت سے مفہوم مشتبہ ہو جایا کرتے ہیں۔ بہت سے عقائد ایک دوسرے کے ساتھ خلط ملط ہوجاتے ہیں اور بہت سے مذاہب ایک دوسرے کے ساتھ گھل مل جاتے ہیں۔ گذشتہ ادوار کی طرح اسلام آج بھی اسی دور ابتلاء سے گذر رہا ہے کہ کبھی تو اس کے بعض افکار پر دبیز پردے پڑجاتے ہیں اور بعض اوقات ان میں کچھ اشتباہات راہ پالیتے ہیں جو انہیں مشکوک بنا ڈالتے ہیں۔ لہذا اسلام کو اس کی اصلی صاف و شفاف صورت میں سمجھنے کے لئے ایک طرف تو اسلام کے ابتدائی اصول اور سر چشموں یعنی قرآن اور سنت کی طرف رجوع کرنا اور ابتدائی دور کے حالات و کوائف کو اچھی طرح سمجھنا بے حد ضروری ہے۔ اور دوسری طرف ان حجابات کا دور کرنا بھی ضروری ہے جنھوں نے اسلام کے روشن چہرے کو چھپا لیا ہے۔ نیز ان اسباب و عوامل کو دریافت کرنا انتہائی ضروری ہے جنھوں نے اسلام کے بعض تصورات کو تبدیل کردیا ہے۔

اسلام اور دور جدید

اسلام کو اس عہد میں چند مراحل سے گزرنا پڑا ہے۔ پہلا مرحلہ تو وہ تھا جسے ہم یوں کہیں تو بیجا نہ ہوگا کہ وہ ایک عرصہ تک اغیار کا مطعون رہا۔ چنانچہ گذشتہ عہد میں اسلام کے داعی اور مبلغ، اسلام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی طرف سے بعینہ اس انداز سے مدافعت کرنے میں مشغول رہے گویا اسلام واقعی قصوروار ہے ۔ چنانچہ ان حضرات کا سارا زور ان مدافعتوں ہی پر صرف ہوتا رہا کہ اسلام، ترقی کے راستہ میں رکاوٹ نہیں، نہ وہ آگے بڑھنے سے روکتا ہے' اور نہ علم و عقل کا معارض ہے ۔ گویا اسلام کی حیثیت قطعاً ایک مجرم کی سی تھی جس کی طرف سے صفائیاں پیش کی جارہی تھیں - اس کا اندازہ آپ کو ان اسلامی تصانیف سے ہوسکے گا جو گذشتہ ایک صدی سے ہمارے علماء مرتب کرتے آرہے ہیں ۔ اس کی مثال میں مفتی محمد عبدہ اور فرید وجدی (سرسید احمد خاں اور سید امیر علی) وغیرہ حضرات کی کتابیں پیش کی جاسکتی ہیں- اس کے بعد دوسرا مرحلہ آیا جس میں اسلام تہمت کی زد سے تو باہر ہوچکا تھا لیکن اس کا تجزیہ یا اس کا موازنہ ان آلات اور پیمانوں سے کیا جانے لگا جو اسلام کے اپنے آلات اور پیمانے نہیں تھے- اس کی قدر و قیمت کا اندازہ ان سکوں سے لگایا جانے لگا جو خود اسلام کے اپنے سکے نہیں تھے - چنانچہ کہا جانے لگا کہ اسلام ایک صالح مسلک زندگی ہے اس لئے کہ وہ جمہوریت پر مبنی ہے ۔ وہ زندہ رہنے اور ہمیشہ باقی رہنے کا اس لئے مستحق ہے کہ اس میں لچک پائی جاتی ہے - اسلام اس لئے اچھی چیز ہے کہ اس میں فلاں فلاں افکار پائے جاتے ہیں - اور یہ تمام افکار، تصورات، سکے اور پیمانے وہ تھے جو سب کے سب دیگر مذاہب سے مستعار لئے گئے تھے ۔ گویا اصل بات یہ تھی کہ ہم ان مخصوص و متعین مذاہب پر ایمان لاچکے تھے جو اسلام کے احاطہ سے خارج تھے اور اس کے بعد ہم یہ کوشش کر رہے تھے کہ ان سکوں کے ذریعہ جنہیں ہم نے ان مذاہب سے مستعار مانگا تھا، اسلام کی قدر و قیمت متعین کرسکیں ۔ کیونکہ وہ سکے ہمارے نزدیک بھی مسلم تھے اور ان مذاہب کی پیداوار تھے ، جن پر ہم خود بھی ایمان لاچکے تھے - یہ دوسرا مرحلہ تھا جس سے اسلام گذرا ہے ۔ مگر اسلام ابھی تک پوری طرح اس مرحلہ سے نکل نہیں سکا - آج بھی اسلام کی پیمائش زیادہ تر انہیں غیر اسلامی پیمانوں ہی سے کی جارہی ہے - بجز چند اسلامی ممالک کے جہاں خود نگری و خود بینی کی ابھی محض ابتداء ہے ۔ اس کے بعد تیسرا مرحلہ آیا اور یہی وہ مرحلہ ہے جس کی میرے خیال میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ابتداء ہوچکی ہے اور جو میری رائے میں اسلام کا اپنا ذاتی مرحلہ ہے۔ اسلام کے کچھ اپنے خاص پیمانے اور ذاتی معیار ہیں۔ وہ ایک صالح مسلک زندگی اس لئے نہیں ہے کہ وہ جمہوریت، اشتراکیت یا سرمایہ داری سے مطابقت رکھتا ہے۔ یا اس میں انفرادی آزادی کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے یا اس میں اجتماعی مفادات کی ضمانت موجود ہے یا اس میں فلاں فلاں خوبیاں یا فلاں فلاں تصورات پائے جاتے ہیں جو دیگر مذاہب کی پیداوار ہیں۔ بلکہ خیر و شر اور حق و باطل کی تمیز کیلئے اسلام کے خود اپنے پیمانے ہیں۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان پیمانوں کی کچھ عقلی بنیادیں نہیں ہیں جن سے انہیں تقویت حاصل ہوتی ہو۔ بلکہ ہمارے کہنے کا حاصل یہ ہے کہ اسلام کے یہ پیمانے خود وہ بنیادیں ہیں جو عقل کی سر زمین ہی سے ابھرتی ہیں اور وہ شاخیں ہیں جو عقل کے درخت ہی کے تنے سے نشو و نما حاصل کرتی ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کی ابتداء ہمارے اس عہد میں ہوچکی ہے۔ چنانچہ اس کے ابتدائی نقوش معدودے چند تصنیفات میں نظر آنے لگے ہیں۔ اور اس کے اثرات عالم اسلامی کے ابھی چند مفکرین کے اذہان پر پڑے ہیں۔ یہ وہ مرحلہ ہے جس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ مستقبل قریب میں اسلام کا آخری مرحلہ ہوگا۔

ضروری ہے کہ ہم ذرا پیچھے کی طرف لوٹ آئیں تاکہ ان اسباب و علل کا پتہ لگا سکیں جنکی وجہ سے ہم اجنبی سکوں سے اسلام کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے اور اسلامی تصورات کو دیگر مذاہب کے مفاہیم کے ساتھ خلط ملط کرنے میں اثر پذیر ہوئے ہیں۔ خصوصیت کے ساتھ اس بناء پر کہ ہم اس آخر دور میں پیدا ہوئے ہیں جس میں ہم خود انتہائی کمزور ہوچکے ہیں اور ہمارا سابقہ ایک ایسی تہذیب سے پڑا ہے جو اپنی قوت و شوکت کے اعتبار سے اوج ثریا پر فائز ہے۔ یہ ہے یورپ کی جدید مغربی تہذیب، جو اسلامی تہذیب کے مقابلہ میں مادی اعتبار سے انتہائی بلندیوں تک پہنچ چکی ہے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یورپ جس سے ہم دو چار ہوئے ۔

یورپ جس سے ہم دوچار ہوئے ' وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کا یورپ تھا ۔ یورپ ان دونوں صدیوں میں فکری رجحانات اور اجتماعی خصوصیات کے اعتبار سے ایک بلند مقام پر فائز تھا ۔ اسے تین امتیازی خصوصیات حاصل تھیں جو ایک دوسرے سے لازم و ملزوم تھیں ۔ پہلی خصوصیت، دین کے خلاف بغاوت تھی ۔ یورپ میں مسیحیت اپنے اس افسوسناک انجام سے دوچار ہوچکی تھی کہ فکری ارتقاء اور عملی تفکر کا ساتھ نہیں دے سکی جو یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے عہد کے بعد ظہور پذیر ہو چکا تھا ۔ لہذا یورپ میں سخت کشمکش کا دور تھا۔ علم اور دین میں کشمکش ۔ عقل اور دین میں کشمکش۔ یہ کشمکش بڑی شدید اور سخت تھی۔ اس کے بعد دوسری خصوصیت سامنے آئی جو اپنی قدر و قیمت اور خطرناک لتائج میں سابقہ خصوصیت سے کچھ کم نہ تھی ۔ اوروہ یہ تھی کہ مشینی اختراعات اور صنعت و حرفت کی گرم بازاری نے معاشرہ میں نئے طبقات پیدا کردئیے تھے اور سرمایہ کو محنت سے جدا کردیا تھا ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ عمال (مزدوروں اور کسانوں) کا ایک طبقہ پیدا ہوگیا اور اس طبقہ کو جن اجتماعی مظالم سے سابقہ پڑ رہا تھا ان کا مقابلہ کرنے کے لئے اشتراکیت کی تحریک شروع ہوگئی ۔ اس سے آزادی، جمہوریت اور اشتراکیت کے وہ نئے تصورات پیدا ہوئے جو ان تاریخی اور مقامی حالات ہی کی پیداوار تھے ۔ تیسری خصوصیت ' یورپ میں قومی منافست کا ظہور تھا ۔ اقوامِ یورپ اور ان کی قومیتوں کے جوش مسابقت نے ایسے مخصوص حالات کو جنم دیا جنھوں نے خود قومیت ہی کو ایسی بنیاد قرار دیدیا کہ پوری زندگی اسی کے گرد گھومنے لگی ۔ اور قومیت کو ایسے عقیدہ کی حیثیت دیدی کہ ان کی پوری سیاسی اور فکری زندگی کی عمارت اسی پر کھڑی ہونے لگی ۔ یہ عقیدہ بھی در اصل کچھ مخصوص حالات ہی کی پیداوار تھا اور انہیں حالات نے اسے جنم دیا تھا ۔ وہ صرف عقلی منطق کا پیدا کردہ نہیں تھا ۔ یہ وہ نمایاں مظاہر تھے جو یورپ میں اس عہد میں ظاہر ہو رہے تھے جب ہم اس سے دوچار ہوئے۔ تو اس کے نتیجہ میں فکر، اقتصاد اور سیاست

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے میدانوں میں بھانت بھانت کے متعدد نئے افکار پیدا ہوا لگے جن سے ہم متاثر ہوتے رہے - مثال کے طور پر ذرا ان تمثیلوں پر غور فرمائیے جو بعض افکار کے لئے استعمال کی جاتی ہیں - وہ سب کی سب انہی مخصوص حالات کی پیداوار ہیں - ان میں وہ افکار بھی داخل ہیں جن کا تعلق دین سے ہے - مگر وہ بھی انہی کوائف و ظروف اور تاریخی احوال سے تعلق رکھتے ہیں -

ہمارے آج کے بہت سے اسالیب فکر وہ ہیں جو ہم نے مغرب ہی سے مستعار لئے ہیں اور اسی تہذیب سے اثر پذیری کا نتیجہ ہیں جو اس مرحلہ میں ہماری طرف منتقل ہوئی ہیں - اس کی ایک مثال دین اور علم یا دین اور عقل کے درمیان تصادم کی دشواری بھی ہے - یہ دشواری اگرچہ پرانے زمانے سے چلی آرہی ہے مگر اس نے اب سے پہلے اتنی شدت اور سرگرمی کی صورت اختیار نہیں کی تھی - اسی طرح تعلیم کے سلسلہ میں دینی اور دنیوی کی الگ الگ تقسیم اور اس کے ساتھ ہی ''علمائے دین'' یا ''رجال دین'' کی اصطلاح کا حال بھی ہے - اگر ہم عہد عباسی کے بعد اور اس سے پہلے کی تصنیفات اور کتابوں پر غور کریں تو ہمیں اس قسم کی اصطلاحیں ان کتابوں میں کہیں بھی نظر نہیں آتیں، ان سے نہ عربی زبان مانوس ہے اور نہ ہی اسلام متعارف ہے - یہی حال زندگی کی اس تقسیم کا بھی ہے جو دو الگ الگ اجزاء میں اس انداز سے کردی گئی ہے کہ ان دونوں میں کبھی اتحاد و اتصال کی صورت ہی پیدا نہیں ہوتی - یہ دونوں اجزاء دین اور دنیا ہیں - چنانچہ اس تفریق کے نتیجہ میں ہیئت اجتماعیہ اور حکومت سے دین کو بالکل ہی خارج کردیا گیا ہے - یعنی دین کو ایک شخصی اور ذاتی معاملہ قرار دیکر عام زندگی سے اس کو بالکل ہی بے دخل کردیا گیا ہے - یہ امر بھی دراصل انہی مفہومات میں سے ہے جو ہماری طرف منتقل ہوکر آگئے ہیں - اس سے ایک اور رجحان پیدا ہوا جسے '' علمانیت '' (یا ''ملا ازم'') کہا جاتا ہے - جس کا مقصد یہ ہے کہ حکومت دین سے الگ تھلگ رہے اور دینی معاملات میں دخل اندازی نہ کرے -

اسی طرح ایک دوسرا رجحان ''لادینیت'' (یا ''سیکولرزم'') کا ہے جس کا مقصد دینی رجحانات کے خلاف جنگ کرنا ہے - ان ہی رجحانات میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے اخلاق کے متعلق یہ تصور بھی ہے کہ اس کا مستقل اقدار سے کوئی واسطہ نہیں - ہر جگہ کا اپنا اخلاق ہوتا ہے - یہ تصور بھی ان خصوصی حالات و کوائف ہی کی پیداوار ہے جن میں دینی اخلاق، رسمی اخلاق' اور سیاسی پرانے طور طریقے، جدید انقلابی طور طریقوں کے ساتھ ٹکراتے رہے - حالانکہ اس سے پیشتر ایک مدت دراز تک انہی اخلاق اور طور طریقوں کا دور دورہ رہ چکا تھا - ظاہر ہے کہ یہ تصور صحیح نہیں ہے - جس کی دلیل یہ ہے کہ یہ حقائق اور احکام نیز اخلاقی اقدار ہزارہا سال سے مسلم چلے آرہے ہیں - مثلاً غیظ و غضب کا برا ہونا، دوسروں کو نقصان پہنچانے کے جذبے اور زناکاری کے عمل کی برائی کہ دنیا کی اکثر آبادیوں میں ان برائیوں کو ہمیشہ سے ناجائز اور حرام ہی سمجھا جاتا رہا ہے - آن بعض ہیئات اجتماعیہ کا کوئی اعتبار نہیں ہے ' جن کے فیصلے اس کے خلاف ہوں کیونکہ گر کہیں ایسے حالات پائے جائیں تو وہ خواہ کتنے ہی پسندیدہ کیوں نہ ہوں انہیں بہر حال شاذ و نادر ہی کے حکم میں رکھنا ہوگا - کسی خاص زمانہ میں کوئی خاص ہیئت اجتماعیہ اگر استبداد و ظلم کو اچھی نظر سے دیکھتی ہے تو اس سے استبداد اور ظلم مستحسن نہیں ہوجاتا- یہ فیصلہ بہر حال اٹل ہے کہ وہ ایک برائی ہے - اور اس کا مقابلہ کرنا واجب ہے - یہ فیصلہ تبدیل نہیں ہوسکتا -

ان ہی غلط افکار میں سے جو یورپ کی ہیئت اجتماعی سے وہاں کے اجتماعی حالات اور خصوصی مناہج فکر کی بناء پر یورپ میں رواج پاجانیکے بعد ہم تک منتقل ہوئے ہیں، تدریجی ارتقاء کو ایک اخلاقی قانون کی حیثیت سے تسلیم کرلینا بھی ہے - یعنی علی الاطلاق یہ فیصلہ کردینا کہ ہر نیا طریقہ اس پرانے طریقہ سے افضل اور بہتر ہے جو اس سے پہلے گذر چکا ہے- یہ صحیح ہے کہ ارتقاء ایک اجتماعی اور واقعی قانون کی حیثیت رکھتا ہے - لیکن اس کا تقاضا بہرحال یہ تو نہیں ہے کہ زندگی کا آخری انداز ہمیشہ سابق اندازوں سے بہتر ہی ہوا کرے - اجتماعی ارتقاء کا تصور در اصل حیاتی ارتقاء (بایولوجی) سے پیدا ہوا ہے - اگرچہ حیاتی ارتقاء اکثر ترقی اور بہتری کا باعث ہوتا ہے - لیکن کبھی کبھی تنزل اور رجعت قہقری کا باعث بھی ہوجاتا ہے - بلکہ بعض اوقات تو بالکلیہ خاتمہ کا سبب بھی بن جاتا ہے -

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یورپ کے اکثر فلسفیانہ اور اجتماعی مسالک و مذاهب کا خیال یہ ہے کہ اخلاق کے کچھ مقررہ پیمانے اور متعین احکام نہیں ہوا کرتے۔ بلکہ ہر قوم کے اپنے اپنے اخلاق ہوا کرتے ہیں - مثال کے طور پر وہ کہتے ہیں کہ بعضوں کے نزدیک شراب خوری ایک بدترین فعل ہے مگر بعض دوسری قومیں اس کے خلاف رائے رکھتی ہیں- اسی طرح بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ زنا ایک بدترین اور قبیح کام ہے مگر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مہمان نوازی کے لئے اس کو روا سمجھتے ہیں۔ لہذا ان کے نزدیک یہ بڑی حد تک ایک نسبتی معاملہ ہے کہ بعض اخلاق بعض قوموں کی نسبت سے پسندیدہ ہوسکتے ہیں اور دوسری قوموں کی نسبت سے غیر پسندیدہ - ایسی کوئی مستقل اخلاقی بنیادیں یا مستقل اخلاقی اقدار نہیں ہیں جن کے مطابق ہر اخلاق کو ہر قوم کے لئے یکساں طور پر پسندیدہ یا غیر پسندیدہ قرار دیا جاسکے - لہذا جیسے تمہارا جی چاہے تم اختیار کرسکتے ہو - جب کوئی ہیئت اجتماعی کسی خاص جدید اخلاقی فکر تک ترقی کرکے پہنچ جائے تو وہی چیز اخلاق بن جاتی ہے جس پر عمل کرنا ضروری ہوجاتا ہے - یہ تصور بھی انہی افکار میں سے ہے جن کے متعلق میرا عقیدہ بھی ہے کہ ان حالات و کوائف کا نتیجہ ہیں جن سے یورپ گذر چکا ہے -

مغربی ہیئت اجتماعی اور اسلامی ہیئت اجتماعی کے ٹکراؤ کے نتیجہ میں جو فکری جدوجہد پیدا ہوئی ہے اور جس سے ہم گذر رہے ہیں وہ اسلامی فکر جدید پر گہرا اثر چھوڑ گئی ہے۔ حتی کہ اسلامی طبقات کی بڑی اکثریت، خصوصیت کے ساتھ وہ طبقہ جو متمدن اور مہذب کہلاتا ہے بلکہ وہ طبقات بھی جو غیر مہذب کہلاتے ہیں ان ہی افکار سے اثر پذیر ہوئے ہیں - ان میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو اسلامی اقدار پر ناک بھوں چڑھاتے ہیں اور وہ لوگ بھی جو اسلامی اقدار کو قبول تو کرتے ہیں اور ان کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں مگر ذہنی طور پر ان کا حال بھی وہی ہے- دونوں ہی یکساں طور پر فکری اعتبار سے اثر پذیر ہوئے ہیں -

شخصیتوں کا اختلاط

مندرجہ بالا سرسری جائزہ کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں سے کچھ تو ایسے مسلمان ہیں جو اپنی شعائر و رسوم کے اعتبار سے تو مسلمان ہیں لیکن اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

افکار کے اعتبار سے غیر مسلم ھیں۔ جس کے معنے یہ ھیں کہ ان کی شخصیت در اصل دو شخصیتوں کا مجموعہ ہے ۔ انھوں نے ایک ایسے معاشرہ میں پرورش پائی جو دینداری کا عادی تھا ۔ لہذا وہ شعائر و رسوم کے اعتبار سے تو مسلمان ھیں ۔ لیکن ساتھ ھی انھوں نے ایک ایسے معاشرہ میں بھی نشو و نما پائی ہے جن کی فکری سطح اسلامی نظریات سے ھم آھنگ نہیں تھی ۔ لہذا جب وہ زندگی کے کوائف و ظروف پر غور کرتے ھیں چاھے وہ عام فکری حیات سے تعلق رکھتے ھوں یا اجتماعی، اخلاقی، سیاسی یا دوسرے شعبوں سے تو وہ ان پر اسلامی فکر کے مطابق غور و فکر نہیں کرتے۔ البتہ اپنی مخصوص زندگی میں وہ مسلمان ھی سمجھے جاتے ھیں ۔ فکری یا نفسیاتی اعتبار سے یہ بالکل ھی ایک نئی مخلوق ہے ۔ عالم اسلامی میں دو قسم کے مخلوط نظام تعلیم رائج رہے ھیں ۔ ایک تو اسلامی تعلیم کا ۔ لیکن یہ نظام تعلیم اپنے طریقہ، وسائل، اور سطح کے اعتبار سے قدیم ہے جس کا سراغ ھمیں ان صدیوں میں ملتا ہے جو عباسی عہد حکومت کے بعد گذر چکی ھیں ۔ دوسرا نظام تعلیم وہ ہے جس کا سر چشمہ مغرب، مغربی افکار اور مغرب کی جدید تہذیب ہے ۔ اور ان نفسیاتی اور فکری اثرات نے جو بعض لوگوں میں شدت سے ظہور پذیر ھوچکے ھیں، بعض عجیب و غریب اور مخصوص نوعیت کے مظاھر پیدا کردئیے ھیں۔ مثلاً اس نوع کا ایک مظاھرہ یہ بھی ہے کہ بہت سے اسلامی احکام میں اس انداز کی تاویلیں کی جانے لگی ھیں جو زیادہ تر تکلف و تعسف سے خالی نہیں ھوتیں۔ ان تاویلات کا مقصد یہ ہے کہ اسلام اور دوسرے مذاھب میں تطبیق کی کوئی صورت نکالی جائے ۔ لیکن یہ سب کچھ اسلام کی قربانی دیکر کیا جاتا ہے ۔ گویا وہ چاھتے یہ ھیں کہ اسلام کا حلیہ بگاڑ کر اور اس کی قطع و برید کرکے اسے ایک ایسی بوتل میں بند کیا جاسکے جس کا دھانہ تنگ ھو ۔ چاھے ایسا کرنے کے لئے انھیں اس کے ھاتھ پاؤں یا اس کے جسم کے کسی بنیادی عضو ھی کو کاٹنا چھانٹنا کیوں نہ پڑجائے ۔ میں سمجھتا ھوں کہ اگر اس سلسلہ میں میں کچھ مثالیں پیش کروں تو کوئی حرج نہیں ھوگا ۔ لیکن مجھے یہ عرض کرنے کی اجازت دیجئے کہ یہ مثالیں میری ذاتی رائے پر مبنی ھیں ۔ ھو سکتا ہے کہ کچھ دوسری مثالیں اس مقام پر زیادہ بہتر ھوسکتی ھوں اور انھیں بہتر طور پر استشہاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنا ممکن ہو۔

اس سلسلہ میں پہلی مثال نامور شخصیتوں کی یاد تازہ رکھنے کے لئے ان کے مجسموں کا قائم کرنا ہے ۔ بعض مغربی تہذیب سے متاثر ہونے والوں کا خیال ہے کہ اسلام میں مجسمہ سازی چند وجوہ سے حرام کی گئی تھی جو اب باقی نہیں رہیں لہذا اگر آج ہم اپنے سربرآوردہ نامور لوگوں کے مجسمے نصب کرنے لگیں تو اس میں کوئی شرعی قباحت نہیں ہے ۔ مگر وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ اسلام میں مجسمہ سازی اور ان کی تنصیب کی حرمت کی وجہ صرف بت پرستی کے رجحان کو روکنا ہی نہیں ہے ۔ بلکہ اس سے کہیں گہری ہے ۔ نامور شخصیتوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لئے اسلام نے اس انداز کو کبھی بھی اختیار نہیں کیا ۔ بلکہ اس نے معنوی اور ذہنی تقدیس و عظمت اور احترام پر زور دیا ہے اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ ذہنی تقدیس اور حرمت و عظمت کے اثرات مجسموں کی تنصیب سے کہیں زیادہ دیرپا اور گہرا اثر چھوڑ جانے والے ثابت ہوئے ہیں ۔ آج تقریباً چودہ سو سال گذر جانے کے باوجود بھی حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ، خلفائے راشدین اور دیگر ائمہ اور بزرگوں کی یاد مسلمانوں کے دلوں میں اس سے کہیں زیادہ تازہ ہے جو یورپ کے لوگوں کے دلوں میں ان کے جگہ جگہ اپنی نامور شخصیتوں کے مجسمے نصب کردینے سے ہوسکتی ہے ۔ میں نے پیرس ، لندن ، ماسکو وغیرہ میں خود اس امر کا مشاہدہ کیا ہے کہ نامور شخصیتوں کے مجسموں کے سامنے وہاں کے پڑھے لکھے تعلیم یافتہ باشندوں پر بھی وہ اثرات مرتب نہیں ہوتے جو کسی جاہل سے جاہل مسلمان کے سامنے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین اور دیگر بزرگان دین کا محض نام لے دینے سے مرتب ہوجاتے ہیں ۔ حالانکہ ان تمام حضرات کے مجسمے کبھی بھی کہیں نصب نہیں کئے گئے۔

مجھے عرض کرنے دیجئے کہ مجسمے وہی قومیں نصب کرتی ہیں جو قدیم الایام سے بت پرست رہی ہیں اور جن کے ہاں ہمیشہ سے یہ ذہنیت کارفرما رہی ہے کہ جب کوئی ہیرو ان کی قوم میں پیدا ہوا تو انہوں نے ہمیشہ اسے انسانوں کی صف سے الگ کرکے دیوتاؤں کی صف میں شامل کردیا کیونکہ ان کی عقل میں کبھی یہ بات آ ہی نہیں سکی کہ ہیرو بھی انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوسکتا ہے۔ اسی ذہنیت کے ماتحت انھوں نے اپنے ہیروؤں کو دیوتا بنا کر ان کے مجسمے نصب کئے۔ آج بھی وہی ذہنیت ایک دوسرے روپ میں اپنی نمائندگی کررہی ہے۔ ظاہر ہے کہ اسلام اس نقطۂ نظر کا حامی نہیں ہے۔

لاٹری اور سٹہ بازی بھی اسی کی ایک مثال ہے جس کے متعلق میرا خیال ہے کہ اس کا بظاہر گہرا ماحصل یہی ہے کہ اخلاق کے سر چشمے جو ایمان کی گہرائیوں سے پھوٹتے ہیں ان کے سوتے دلوں میں خشک ہوگئے ہیں۔ اور لوگ اس قدر مادہ پرست بن چکے ہیں کہ وہ مادی منفعت، اور منفعت اندوزی کے علاوہ کسی چیز کو اہمیت ہی نہیں دیتے۔ جب تک اشیائے صرف کی قیمتیں نہ بڑھ جائیں کسی نیک کام کے لئے ان سے ایک پیسہ وصول نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا سٹہ اور لاٹری کا ادارہ دلوں کے اخلاقی چشموں کے خشک ہوجانے پر مبنی ہے۔ دلی جذبات، اور نفس کی گہرائیوں سے جب اخلاق کے سوتے پھوٹتے ہیں تو ان کا مظاہرہ ہمیشہ قربانی اور ایثار کی شکل میں ہوتا ہے مگر یہاں تو اس کا ظہور قیمتیں بڑھانے کے خسیس اور ناجائز کسب کی صورت ہی میں ہورہا ہے۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے مسائل ہیں۔ میں یہاں چند مثالیں پیش کرنے پر ہی اکتفا کرتا ہوں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں اس نوع کی خرافات یا اس قسم کے رجحانات کے درمیان جن کا نام میں "تکلف، و تاویل" رکھتا ہوں اور نئے حوادث اور نئے واقعات کی کیفیات کا اندازہ لگانے کے درمیان جن کے لئے واقعی شریعت اسلامیہ سے احکام مستنبط کرنے کی ضرورت ہے فرق کرنے کا قائل ہوں۔ اس قسم کے مسائل کو میں آئندہ بیان کروں گا۔

اسلامی مفہومات میں رنگ آمیزی

اسلامی تصورات میں رنگ آمیزی کا رجحان جو آج دوسری تہذیبوں سے ٹکراؤ کی بنا پر پیدا ہورہا ہے۔ ہماری تاریخ میں کوئی انوکھا رجحان نہیں ہے۔ ہماری پرانی تاریخ بھی اس قسم کے رجحانات سے بھرپور ہے۔ اس سے پہلے ہمارا ٹکراؤ اور تصادم یونانی فکر کے ساتھ ہوچکا ہے اور اسی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تصادم سے بیشمار نئے رجحانات پیدا ہوئے تھے مثلاً علم کلام کے مسائل - کیونکہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ اسلامی عقیدہ نے یا زیادہ صحیح طور پر یہ کہہ لیجئے کہ اسلامی ایمان نے ——— کیونکہ عقیدہ کا لفظ بھی خود بعد کی پیداوار ہے ——— حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے عہد مین یہ فلسفیانہ جدلی صورت اختیار نہیں کی تھی جو عہد عباسی میں اسے حاصل ہوئی -

اس سے پہلے ایمان کا لفظ ——— ایمان، قرآنی لفظ ہے ——— عقلی اور نفسیاتی دونوں معنوں پر مشتمل تھا - یہ دونوں رجحانات ——— یعنی عقلی اور نفسیاتی ——— ظہور اسلام کے وقت ابتدائی عہد میں ایک دوسرے کے ساتھ ملے جلے اور پوری طرح ایک دوسرے میں گٹھے ہوئے تھے - پھر ہم یکایک دیکھتے ہیں کہ اسلام کی تین الگ الگ شاخیں ہوگئیں- ایک شاخ تو فقہ کی تھی جس کا کام عبادات و معاملات کے سلسلہ میں ظاہری احکام و شعائر سے بحث کرنا تھا - دوسری شاخ وہ تھی جو اسلام کے اعتقاد عقلی کے گوشوں سے بحث کرتی تھی - اس کو ”علم کلام“ ”عقیدہ“ یا ”علم توحید“ کا نام دیا گیا - اسلام کی تیسری شاخ قلبی اور اخلاقی گوشوں سے تعلق رکھتی تھی - اسے اخلاق یا زہد کہہ لیجئے - یہ وہی شاخ ہے جو صدر اول کے بعد تصوف کے نام سے پکاری گئی- لہذا اس کا ما حصل یہ نکلا کہ اسلام تین شعبوں سے مرکب مانا گیا، جن میں سے ہر شعبہ ایک دوسرے سے الگ تھا - فقہ - کلام - اور اخلاق -

اس گذارش سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ فقہاء اسلام کو علم کلام سے کوئی واسطہ نہیں تھا یا متکلمین، سب کے سب فقہ سے بالکل بے بہرہ ہوا کرتے تھے - یا زاہد اور واعظ حضرات کو فقہ اور عقائد سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی تھی- بلکہ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں پر کسی ایک شعبہ کا غلبہ ہوا کرتا تھا - چنانچہ کچھ لوگ متکلم کہلاتے تھے - کچھ فقیہ کہلاتے تھے اور کچھ زاہد اور صوفی کہلاتے تھے - اگرچہ بعض شخصیتیں ایسی بھی گذری ہین جو ان تینوں شعبوں کی جامع تھیں - بہر حال یہ حقیقت ہے کہ اسلام جو کبھی ایک جامع وحدت ہوا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرتا تھا اس کے بعد ان مختلف پہلوؤں میں بٹ گیا جو ایک دوسرے سے الگ الگ تھے ۔ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ خود اسلام کی اپنی صورت ھی چند گوشوں میں بٹ گئی ۔ ایک اسلام تو علم کلام کا ھوگیا ۔ دوسرا اسلام اخلاق کا قرار پایا گیا اور تیسرا اسلام فقہ کا سمجھ لیا گیا ۔ حالانکہ اسلام تو اسلام ھی ھے ۔ وہ نہ کلام کا اسلام ھے نہ فقہ کا اسلام ھے اور نہ تصوف کا اسلام ھے ۔ میرے نزدیک مختلف پہلوؤں والے اسلام کو ممکن ھی نہیں کہ اسلام کی مکمل اور کامل صورت سمجھا سکے ۔ اسلام کے ان مختلف پہلوؤں میں بٹ جانے سے ھوسکتا ھے کہ علمی اور تدریسی اعتبار سے کچھ افراد کے لئے کسی قدر سہولت و کفایت ھوگئی ھو لیکن ظاھر ھے کہ اجزاء سے وہ بات حاصل نہیں ھوسکتی جو مرکب صورت میں ایک مجموعہ کے اندر ھوسکتی ھے ۔ پہلی قسم کا اسلام صدر اول یعنی صحابۂ کرام کا اسلام تھا جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد جمع رھتے تھے ۔ یہ اسلام ان تینوں اجزاء کو مرتب، متوازن اور زندگی بخش انداز میں جمع کئے ھوئے تھا ۔ لہذا یہ بات انتہائی ضروری ھے کہ ھم اسلام کو (فی ذاتہ) ان تصورات سے الگ کرکے دیکھیں جو مختلف ادوار میں اسلام کو سمجھنے کے سلسلے میں مسلمانوں نے قائم کئے تھے ۔ ایک تو وہ اسلام ھے جو اپنی اصل اور سرچشمہ کے ذریعہ سے یعنی کتاب و سنت کے ذریعہ ، جو اس کے اصلی مصادر ھیں، سمجھا جاسکتا ھے اور دوسرے ھر عہد کے مسلمانوں کی اپنی اپنی فہم ھے ۔ چنانچہ ھر زمانہ میں بعض مسلمانوں نے اسلام کو سمجھنے میں غلطیاں بھی کی ھیں ۔ لیکن ان غلطیوں سے اسلام کی ذات پر کوئی عیب نہیں لگایا جاسکتا ۔ اور نہ ھی اسلام کے اصل مصادر اور اس کی حقیقی صورت پر خوردہ گیری کی جاسکتی ھے ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ جس فہم کو ھم اسلام کی حقیقی تصویر سے قریب تر سمجھ سکتے ھیں اور جس سے ھم اسلام کو سمجھنے میں مانوس ھوسکتے ھیں وہ در حقیقت صدر اول یعنی عہد صحابہ و تابعین ھی کی فہم ھوسکتی ھے ۔ میرا مقصد اس بیان سے یہ نہیں ھے کہ بعد کے تمام زمانوں میں مسلمانوں نے اسلام کے متعلق جو کچھ سمجھنے کی کوششیں فرمائی ھیں میں خدانخواستہ ان کی تنقیص کروں ۔ واقعہ یہ ھے کہ ھر زمانہ میں بڑے بڑے علماء ، محققین اور ایسے ایسے حقائق کا ادراک کرنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

والے پیدا ہوتے ہیں جن کے حلقے اور سلسلے آج تک جاری ہیں اور ختم نہیں ہوئے۔ بلکہ میرا مقصد صرف اتنا ہے کہ جب تک ہم اسلام کے رخ تاباں سے ان حجابات و نقابات کو نہ اٹھائیں خواہ وہ ہمارے زمانہ کے ہوں یا پچھلے زمانوں کے، اسلام کی ذاتی اور حقیقی صورت ہمارے سامنے نہیں آسکتی۔ اسلام درحقیقت ایک نظام کامل ہے - وہ اپنے طور پر خود زندگی کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے - وہ ایک ایسا تصور ہے جو خود وجود پر بھی حاوی ہے - اس کا تعلق صرف سمجھ لینے ہی سے نہیں بلکہ سمجھ کر اس پر یقین کرنا بھی ضروری ہے - پھر اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی نظام بھی ہے جس کے سوتے خود اس تصور اور ایمان ہی کے سر چشموں سے پھوٹتے ہیں -

اسلامی تصور یا اسلامی مفہوم کا ایک عام خلاصہ یہ ہوگا کہ یہ عالم طبعی جو انسان کو احاطہ کئے ہوئے ہے اور یہ ساری کائنات جس میں انسان زندگی گذارتا ہے، اس کا افق اور اس کی مسافتیں کتنی ہی وسیع کیوں نہ ہوجائیں ، یہ حقیقت اپنی جگہ پر اٹل ہے کہ یہ ساری کائنات ایک مخلوق ہے - جس کے اوپر ایک قوت خالقہ اور ایک حیات مدرکہ موجود ہے - یہ خالق کی قوت ہے - اس کائنات اور اس سر زمین میں انسان بذاتہ اسی خدائے خالق کا خلیفہ ہے تاکہ وہ اس میں زندگی بسر کرے اور اس میں جو نعمتیں طبعیات اور ارزاق بلکہ حلال اور مشروع لذات کی پائی جاتی ہیں ان سے استفادہ کرے مگر ساتھ ہی یہ بھی اچھی طرح سمجھ لے کہ اسے اپنی اس خلافت ، استفادہ، اور سعی و عمل کا حساب بھی دینا ہے اور اس قوت خالقہ، مدرکہ، اور محاسبہ کے سامنے ہر بات کی جوابدہی بھی کرنی ہے - اس فہم اور ایمان سے عمل اور عبادت کے دو ہموار پہلو اور سوتے پھوٹتے ہیں جن میں شدید اتصال پایا جاتا ہے - یعنی مثلاً زمین میں کھیتی کرنا اور ساتھ ہی اس قوت خالقہ کی صنعت و کاریگری پر غور و فکر کرنا جس نے زمین کو پیدا کیا اور اس میں انسان کے لئے طرح طرح کی نعمتیں پیدا کیں - یہ عمل اور عبادت دراصل ایک ہی قسم کی چیزیں ہیں - چنانچہ وہ جب زمین میں ہل چلاتا ہے یا اپنے ہاتھ سے ہل کو حرکت دیتا ہے تو وہ خدا کی ہی اطاعت کرتا ہے - وہ اس طرح جہاں اللہ کا مطیع اور فرمانبردار ہے وہیں اسی کا عبادت گذار بھی ہے - اسی طرح جب وہ دن کی چند ساعتوں میں تنہائی میں اپنے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

خالق کا تصور کرتا ہے اور غور کرتا ہے کہ اس موجودہ زندگی کے بعد جوابدھی اور حساب کا مرحلہ بھی پیش آنا ہے تو وہ اس وقت بھی خدا کا مطیع ہوتا ہے۔ اس فکر یا اس عقیدہ یا اس ایمان کے ماتحت صحیح طور پر کچھ اخلاقی تعلیمات جنم لیتی ہیں۔ یہ تعلیمات ایک طرف تو زندگی کے کچھ واقعی مسائل کو حل کرتی ہیں اور دوسری طرف وہ روحانی ترقی کے لئے بھی کام کرتی ہیں۔ اس طرح وہ اذھان کے لئے ایک وسیع میدان مہیا کردیتی ہیں۔ انھیں متعین حدود میں کام کرنے کا موقعہ دیتی ہیں اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرتی ہیں اور اس انداز سے کام کرتی ہیں کہ اس کے تمام اعمال اخلاقی اور روحانی ترقی کے ساتھ ہم آہنگ ہوتے چلے جاتے ہیں۔ میں اس موقعہ پر اسلام کے اخلاقی نظام کی تلخیص اس سے زیادہ الفاظ میں نہیں کرسکتا۔ پھر وہ انسان جو اس طرح کا ایمان رکھتا ہو اور زندگی میں اس انداز پر عمل کرتا ہو وہ تنہا ایک فرد نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ ایک ایسا انسان ہوتا ہے جو ایک اجتماعی ہیئت کا حصہ ہوتا ہے اور اسی اجتماع میں زندگی بسر کرتا ہے۔ اسلام ہی اس کے رجحانات، صفات اور افراد کے ایک دوسرے کے ساتھ باھمی تعلقات کی حد بندی کرتا ہے۔ اسلام اس فرد کی تکمیل کا سامان اس حیثیت سے کرتا ہے کہ وہ ایک معاشرہ یا ہیئت اجتماعیہ کا جزو ہے۔ اس کے لئے ایسے قوانین اور ہدایات صادر کرتا ہے جس میں فرد کی مصلحت اور جماعت کی مصلحت پورے اعتدال و توازن کے ساتھ جمع ہوجاتی ہیں۔ وہ اس کے لئے ایک نظام اجتماعی قائم کرتا ہے جو اس کی انسانی یعنی مادی اور روحانی ترقیات کا ضامن ہوتا ہے۔ یہ نظام اجتماعی نظام حکومت پر بھی مشتمل ہوتا ہے جس کی بنیاد و اساس، شوریٰ، مساوات، عدالت اور جوابدھی کے تصور پر قائم ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ نظام اجتماعی ایک اقتصادی نظام بھی پیش کرتا ہے جو ایک طرف عدالت اور انصاف پر مبنی ہوتا ہے اور دوسری طرف باھمی اجتماعی کفالت پر بھی مبنی ہوتا ہے۔ وہ نظام اجتماعی ایک ایسے عائلی نظام پر بھی مشتمل ہوتا ہے جس میں ایک طرف ابتدائی دور کے آزاد فطری رجحانات کا رنگ بھی جھلکتا ہے اور ساتھ ہی ایک تربیت یافتہ سلیم الطبع ہیئت اجتماعیہ کا رنگ بھی منعکس ہوتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ ہیئت اجتماعیہ جس کے سیاسی ، اقتصادی اور عائلی پہلوؤں کی اسلام تنظیم کرتا ہے تاکہ انسان اس کے ذریعہ سے سعادت و ارتقاء کی منزلیں طے کرسکے دراصل چند اخلاقی اور اعتقادی بنیادوں پر ہی قائم ہے - جو اس کے نظام کے تنوں اور اس کی عمارت کی بنیادوں کا کام دیتی ہیں- چنانچہ اسلامی تشریع جو اپنے موضوع اور تنظیم کے اعتبار سے چند ظاہری بنیادوں اور موضوعی ضوابط پر مبنی نظر آتی ہے دراصل خود انسانی نفس میں اس کے اخلاقی بیج اور اعتقادی اصول جاگزیں ہوتے ہیں - وہی اسے غذا دیتے ، اسے نشو و نما دیتے، اور استحکام بخشتے ہیں - لہذا ایک ایسی تشریع جس کا تعلق اخلاق سے منقطع نہ ہو ، خواہ ان دونوں کی الگ الگ بنیادیں بھی کیوں نہ ہوں، کسی دوسرے انداز تشریع کے ساتھ ملتبس نہیں ہو سکتی - یہ اخلاق ، خود بالذات یا عام فلسفہ یا کامل اعتقاد پر منحصر ہوتے ہیں -

اس طرح اسلامی نظام میں اس کا عقیدہ یا فلسفہ اور اخلاق اور اجتماعی تشریع، سب ایک دوسرے کے ساتھ مل کر ایک مکمل وحدت کی تشکیل کرلیتے ہیں - جو زندگی کی وحدت کا سامنا کرتی ہے - اسلامی نظام کی یہی سب سے بڑی فضیلت ہے جو اسے دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتی ہے - کیونکہ تمام دوسرے نظام زندگی کے پہلوؤں میں سے محض کسی ایک پہلو ہی کی رعایت کرتے ہیں اور یہ تمام پہلو ایک دوسرے سے الگ الگ ہوتے ہیں - وہ زندگی کی طرف اس حیثیت سے غور ہی نہیں کرتے کہ وہ ایک مکمل وحدت ہے - وحدت، توازن، ترتیب و عمومیت ہی وہ خصائص کبریٰ ہیں جو اسلامی نظام کو دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتے ہیں خواہ وہ نظام مادی ہوں یا روحانی ہوں یا دینی ہوں -

اسلامی نظام میں نسبتوں کی تعیین

اسلامی نظام میں وحدت کی خصوصیت کے علاوہ اسی کے پہلو بہ پہلو ایک دوسری خصوصیت بھی ہے جو اپنی اہمیت میں کسی طرح بھی وحدت کی خصوصیت سے کم نہیں ہے - اور یہ خصوصیت زندگی کے پہلوؤں اور اس کی اقدار کے درمیان نسبتوں کی تعیین کی ہے - چنانچہ مال - لذت - عمل - عقل - معرفت - قوت - عبادت - قرابت - قومیت - اور انسانیت وغیرہ زندگی کی اقدار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں سے چند قیمتی اقدار ھیں ۔ اسلام نے اپنے نظام حیات میں ان سب کا مرتبہ اور مقام متعین کرکے ایک نسبت مقرر کردی ھے کہ وہ اس سے آگے نہ بڑھنے پائے ۔ تاکہ کوئی قدر، کسی دوسری قدر پر زیادتی نہ کرسکے۔ چنانچہ ان اقدار کی نسبتوں میں کوئی ایسی تبدیلی عمل میں لانا کہ کوئی قدر اپنی حد سے بڑھ جائے اور کوئی قدر دوسری اقدار کی نسبت سے گھٹ جائے، اسلام کے لئے خالص ملمع کاری اور فریب ھے ۔ جیسا کہ عملاً ھمارے آخری ادوار میں ھورھا ھے ۔ زندگی کے نظام میں نسبتوں کے درمیان کوئی تبدیلی عمل میں لانا ایسا ھی ھے جیسے کوئی مصور کارٹون بناتے ھوئے جسمانی نسبتوں میں تغیر و تبدل کردے ۔ جس میں انسان کے اھم اعضاء اور اجزاء تو سب کے سب موجود ھوں لیکن وہ اس انداز سے ھوں کہ ان سے مسخرہ پن اور استہزاء ٹپکتا ھو۔ یا جیسے کسی مرکب دوا کے اجزاء میں نسبتوں اور اوزان میں تبدیلی کردی جائے جس سے دوا کا مقصد ھی فوت ھوجائے اور اس کی ساری صفات اور خصوصیات بدل جائیں بلکہ بسا اوقات وہ بجائے فائدہ رساں ھونے کے ضرر رساں بلکہ مہلک بن جائے ۔ لہذا اگر ھم زندگی کے مثلاً سو جزو فرض کرلیں تو ھم دیکھ سکتے ھیں کہ اسلام نے ان میں سے عبادت کے لئے چند اجزاء مخصوص کردئیے ھیں، انفاق - کسب - جہاد - مشروع لذتوں سے استفادہ وغیرہ، ھر بات کے محدود حصے مقرر ھیں ۔ اگر ھم ان نسبتوں کو بدل دیں اور مثلاً جہاد کی قیمت گھٹاکر عبادت کی قیمت میں اضافہ کردیں اور مثلاً مال کا حق کسب و انفاق پر دو اعتبار سے گھٹادیں اور لذتوں کو گراں کردیں یا انھیں لغو قرار دیدیں تو اس طرح ھم اسلام کے نظام سے نکل کر کسی اور نظام میں داخل ھوجائیں گے جو اپنی حقیقت اور روح کے اعتبار سے اسلامی نظام کے خلاف ھوگا ۔ اس طرح ھم اس توازن کو برباد کردیں گے جو اسلام نے زندگی کے مختلف پہلوؤں میں قائم کیا ھے ۔ چنانچہ آخری ادوار میں کامل مسلمان اسے سمجھا جاتا تھا جو ھروقت عبادت میں مصروف رھے یہاں تک کہ کسی اور مشغلہ سے اسے سروکار ھی نہ ھو۔ محراب مسجد میں ھمہ وقت معتکف رھے اور اس سے کبھی جدا ھی نہ ھو۔ اپنے اذکار و اوراد میں چوبیس گھنٹے مصروف رھے ۔ یہ صورت حال یقیناً اس صورت سے کوئی مشابہت نہیں رکھتی جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ کے اصحاب نے جو آپ کے بہترین پیروکار تھے اپنی زندگی گذاردی تھی - اگر عبادت ہی ان کی زندگی کا بنیادی جزو ہوتا تو وہ جہاد کی طرف کبھی بھی مائل نہ ہو سکتے۔ معاشرہ کو فاسد عقائد سے آزاد کرنے کی راہ میں جہاد صحیح عقائد کو لوگوں کے قلوب میں راسخ کرنے کے لئے جہاد - ظلم و استبداد سے نجات دلانے کے لئے، کمزوروں کی حمایت کے لئے، لوگوں کے درمیان عدل کے قیام کے لئے، جہاد کرنے کے لئے ان کے پاس وقت ہی نہ رہتا - بالکل اسی طرح ایسے مسلمانوں کی زندگی بھی جو ہمہ وقت جہاد اور اصلاح معاشرہ ہی میں مصروف رہیں، اسلام کی مکمل تصویر کے مقابلہ میں ناقص ہی کہلائے گی جب کہ اس کی زندگی عبادت کے عنصر سے بالکل ہی خالی ہو اور خدا کے ساتھ اس کا تعلق کمزور ہو -

ہمارے فقہائے متقدمین کو اس تصور یعنی باہمی نسبتوں کے تصور کا پورا پورا احساس تھا - چنانچہ انہوں نے ان فرائض وغیرہ کو جن کا ایک مسلمان سے مطالبہ کیا جاتا ہے قوت کے اعتبار سے متفاوت درجات میں تقسیم کردیا ہے - بالکل اسی طرح جیسا کہ انہوں نے ممنوعات اور محرمات کے الگ الگ درجے قرار دئے ہیں - چنانچہ گناہ کے اعتبار سے وہ مجاہد اور سرحد کا محافظ جو جہاد کی صف میں اپنی جگہ کو چھوڑ دے اور وہاں دشمن کو گھس جانے کا موقعہ دیدے، اس شخص کے برابر نہیں ہوتا جو شراب پی لیتا ہے یا سور کا گوشت کھالیتا ہے - حالانکہ دونوں باتیں از روئے شریعت حرام ہیں - قرآن کریم کی آیات اور بیشمار احادیث بھی اس تصور یعنی تعیین مراتب کی طرف اشارہ کرتی ہیں - چنانچہ حق تعالیٰ کا ارشاد گرامی ہے کہ ''اجعلتم سقاية الحاج وعمارة المسجد الحرام كمن امن بالله واليوم الاخر وجاهد في سبيل الله لايستوون عند الله'' (کیا تم نے حاجیوں کو پانی پلادینے اور مسجد حرام کو آباد رکھنے کو ان لوگوں کے اعمال کے برابر سمجھ لیا ہے جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان لاتے ہیں اور اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں ؟ ہرگز نہیں - یہ سب اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہو سکتے -) (سورہ التوبہ آیت ۱۹) -

اگر ہم اس نوعیت کی احادیث جمع کرنا شروع کردیں جو بعض اعمال

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی قدر و قیمت کچھ دوسرے اعمال کے مقابلہ میں متعین کردیتی ہیں تو ہم زندگی کی اقدار کی ریاضی کی کسور کے ساتھ نسبتیں مقرر کرسکتے ہیں ۔ مثلاً حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ امام عادل کا ایک دن کا عمل ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہوتا ہے (۱) نیز حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے کہ ایک عالم کی فضیلت ایک عبادت گذار آدمی پر ایسی ہی ہے جیسے میری فضیلت تم میں سے کسی ادنیٰ آدمی پر (۲) نیز آپ ہی کا ارشاد ہے کہ ایک فقیہ شیطان پر بہ نسبت ہزار عابدوں کے زیادہ گراں ہوتا ہے (۳) ۔

اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہوسکتی ہے جو اپنی تمام تر توجہات کا رخ کسی ایک امر کی طرف موڑدیتے ہیں جو اسلام میں فی ذاتہ مطلوب یا ممنوع ہوتا ہے ۔ جب کہ اس کے مقابلہ میں دوسرے امور بھی ہوسکتے ہیں جو اہمیت میں اس سے بھی بڑھے ہوئے ہوں ۔ مثلاً آج کل اسلامی ممالک دو بڑے خطرات سے دوچار ہیں ان میں سے ایک استعمار ہے اور دوسرا الحاد جن میں سے ایک زمین پر استیلاء اور غلبہ ہے ۔ اور دوسرا عقیدہ پر استیلاء اور غلبہ ۔ یعنی اسلامی ممالک کی مادی اور معنوی دونوں قسم کی ثروتوں کا سلب و نہب ۔ چنانچہ اگر کسی ملک پر مکمل استیلاء حاصل ہو جائے اور وہاں کے باشندوں کے عقائد کو ختم کر دیا جائے اور یہ صورت حال کچھ عرصہ تک قائم رہ جائے تو دینی شعائر کو قائم کرنے، اسلامی اوامر کی تعمیل کرلے، اس کے احکام کی اپنے حالات سے تطبیق دینے کے مواقع ہی کہاں باقی

---

(۱) ایک روایت میں ہے کہ ایک گھنٹے کا عدل و انصاف ساٹھ سال کی عبادت سے افضل ہے یعنی تمام رات کے قیام اور دن بھر کے روزہ سے افضل ہے ۔ اور ایک گھنٹے کا ظلم ساٹھ سال کے گناہوں سے زیادہ سخت ہے ۔ اس حدیث کو طبرانی نے معجم کبیر اور اوسط میں بیان کیا ہے ۔

(۲) اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور صحیح کہا ہے ۔

(۳) اس حدیث کو ترمذی نے بیان کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ حدیث غریب ہے ۔ صرف ولید بن مسلم اسکا راوی ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رہ سکتے ہیں ؟ لہذا لوگوں کے اذہان کو دوسرے معاملات کی طرف موڑنا اور انہیں اسلامی تنازعات کا محور بنا لینا در حقیقت بنیادی معاملات سے انہیں غافل کر دینا ہے ۔ ان میں سب سے اہم اور بنیادی چیز اسلامی ممالک پر براہ راست یا بالواسطہ طور پر مغربی تسلط و استیلاء ہے اور ان مغربیوں کا مختلف طریقوں اور اسلوبوں سے اسلامی عقائد کی بیخکنی کرنا اور ملحدانہ افکار و مذاہب کی اشاعت ہے جس کی صورتیں ہر جگہ مختلف ہیں ۔ تو کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہوگا کہ مسلمانوں کو گروہوں میں تقسیم کر دیا جائے جن میں سے کچھ تو یہ کہہ رہے ہوں کہ تراویح کی رکعتیں آٹھ ہیں اور کچھ یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ نہیں ' یہ بیس ۲۰ ہیں ۔ کچھ کا یہ نظریہ ہو کہ ایک مسجد میں دوبارہ جماعت سے نماز پڑھنا جائز ہے اور کچھ ان کے برخلاف اسے ناجائز سمجھتے ہوں ۔ یا سنت اور بدعت کے معرکے ایسے معاملات میں برپا کرنا جن کا عقائد سے کوئی تعلق نہیں ۔ مدعا یہ نہیں ہے کہ ان موضوعات پر علمی انداز سے بھی بحث نہ کی جائے ۔ بلکہ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس قسم کی تنبیہات اس وقت ضروری ہو سکتی ہیں جب کہ عقائد و عبادت تک کوئی بات پہنچ جائے ۔ تو ایسی صورت میں عبادت وغیرہ کے متعلق صحیح طریقہ کی طرف متنبہ کر دینے میں کوئی مضائقہ نہیں ۔ عبادت کا معاملہ ایسا ہے کہ وہ سب کی سب توفیقی ہیں ۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ حکم دیدیا ہے یا کر کے دکھا دیا ہے اس میں نہ کمی کی جا سکتی ہے نہ زیادتی ۔ لیکن اس کے باوجود اگر اس سے بھی کوئی فتنہ پیدا ہوتا ہو یا مسلمانوں کی دو جماعتوں میں خصومت یا عداوت کی آگ بھڑکتی ہو تو میرے خیال میں اسے بھی چھوڑ دینا واجب ہے ۔ کیونکہ اس کی وجہ سے ایک ایسی ناگوار صورت حال پیدا ہونے کا اندیشہ ہے جو اس اصل منکر (ناپسندیدہ عمل) سے بھی زیادہ منکر ہے ۔ موجودہ احوال و ظروف میں مسلمانوں کی قوت کو پراگندہ کر دینا اور عظیم بنیادی مقاصد کو چھوڑ کر فروعی باتوں کی طرف متوجہ ہونا کسی صورت جائز نہیں ہو سکتا ۔ اس کا نتیجہ تو مسلمانوں کو چھوٹی چھوٹی متعدد ٹکڑیوں میں تقسیم کر دینا ہے جو ان حالات میں خطرناک ترین جرم ہے ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام اور جدید مشکلات کا مقابلہ

(۱) نصوص کو سمجھنے میں تکلیف

مسلمانوں کو جب اس زمانہ میں مغربی تہذیب کا سامنا کرنا پڑا تو مسلمانوں نے مختلف موقف اختیار کئے کیونکہ انہیں متنوع حالات سے دو چار ہونا پڑا تھا ۔ بعض اوقات مسلمانوں نے اسلام کی پیمائش دوسرے پیمانوں سے اور اس کے مسائل کا اندازہ ان اقدار سے کرنا شروع کر دیا جو مسلمانوں کے اپنے نہیں تھے ۔ بلکہ دوسرے غیر مسلم نظاموں سے مانگے ہوئے تھے ۔ کچھ لوگ ایسے بھی نظر آئے جو اسلامی نصوص کو سمجھنے میں تکلف برتنے اور الفاظ کے مدلولات کو سمجھنے میں ٹھوکریں کھانے لگے ۔ اس کی مثال میں وہ لوگ پیش کئے جا سکتے ہیں جو مالی ٹیکسوں کے شعبہ کا بالکلیہ انکار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسلام میں مالی ٹیکسوں کا کوئی وجود ہی نہیں اسلام میں صرف زکوۃ ہے اور اس کے سوا کوئی ٹیکس نہیں ۔ اگر یہ انکار کرنے والے دقیقہ رس ہوتے اور انہیں ذرا بھی واقفیت ہوتی تو ان کو یہ بات معلوم ہونی چاہئے تھی کہ ٹیکس کی حقیقت اس کے سوا کیا ہے کہ وہ مال کی ایک مقررہ مقدار ہوتی ہے جسے حکومت لوگوں سے جبراً وصول کرتی ہے اس کا ایک متعین طریقہ ہوتا ہے جو مال کی مجموعی مقدار پر ایک محدود نسبت سے عائد کیا جاتا ہے ۔ اگر ہم ٹیکسوں کے سلسلہ میں اسلام کے موقف کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھیں گے کہ اسلام بعض ٹیکسوں کو برقرار رکھتا ہے اور بعض ٹیکسوں کا انکار کرتا ہے ۔ خود زکوۃ ہی کو لے لیجئے وہ بھی ایک مالی ٹیکس ہی تو ہے ۔ یہی حال مثلاً خراج اور جزیہ کا ہے ۔ اگر ہم یہ سوال پیش کریں کہ کیا حکومت کا لوگوں پر ایسے ٹیکس لگانا جائز ہے جن کے متعلق کوئی شرعی نص وارد نہ ہوئی ہو ۔ تو اس کا جواب یہی ہوگا کہ اسلام نے ایک قانون بنا دیا ہے جو اس حدیث سے مستنبط ہوتا ہے جو صحیح ترمذی میں نقل ہوئی ہے ۔ کہ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے ۔ "فی المال حق سوی الزکوۃ" (مال میں زکوۃ کے علاوہ بھی حق ہوتا ہے) اس حدیث نے حق کی کوئی تحدید نہیں فرمائی ۔ اگر هیئت اجتماعیہ کی مصلحت مال خرچ کرنے کی مقتضی ہو اور بیت المال میں اتنا مال موجود نہ ہو جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کفایت کر سکے اور یہ مصلحت بھی ضروری ہو ؛ مثلاً اسلامی مملکت کا دفاع یا فقرا و مساکین کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے اگر اموال زکوٰۃ کافی نہ ہو سکتے ہوں اور مزید اموال کی ضرورت ہو تو حکومت اور مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ صاحب مقدرت لوگوں کے اموال میں سے اتنا مال لے لے جو اس ضروری احتیاج کے لئے کافی ہو سکے - اس بناء پر یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ ٹیکس لگانا فی نفسہ کوئی معیوب بات ہے - البتہ اگر حاکم کوئی ایسا مالی ٹیکس لگا دے جس کا کوئی واقعی جواز موجود نہ ہو یا اس سے لوگوں کی ایک بڑی جماعت پر ظلم و ستم ہوتا ہو ' تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ حاکم نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے جسے اسلام قبول نہیں کرتا ۔ اس بات کی قطعاً کوئی اہمیت نہیں کہ ٹیکس (''ضریبہ'') کا لفظ یا اصطلاح ' جدید زمانے کی پیداوار ہے ۔ یہ لفظ یا اصطلاح قدیم زمانہ میں نہیں پائی جاتی تھی- اس لفظ یا اصطلاح کے نئے ہونے سے یہ استدلال تو نہیں کیا جا سکتا کہ اس کا مدلول اور اس کے معنی بھی قدیم زمانہ میں موجود نہیں تھے ۔ بلکہ حقیقت حال تو اس کے بر عکس ہے - کیونکہ اس کا مدلول (یعنی رعیت کے مال میں حکومت کی طرف سے اپنے لئے کچھ حصہ مقرر کر دینا) قدیم زمانہ میں بھی معروف تھا - حتیٰ کہ خود زکوٰۃ بھی دراصل اس وسیع مفہوم کے تحت آتی ہے - البتہ زکوٰۃ ٹیکس کی کم سے کم مقدار ہے جو لامحالہ ضروری ہے - اور جب ہم اس حدیث پر غور کریں جو یہ بتا رہی ہے کہ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی دوسرے حقوق ہوتے ہیں اور ساتھ ہی اس دوسری حدیث پر بھی غور کریں جسے امام مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے کہ ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ''ہم ایک مرتبہ حضور کے ساتھ سفر کر رہے تھے ۔ یکایک ایک آدمی اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر آیا اور دائیں بائیں نظریں گھمانے لگا - تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ سواری ہو تو وہ اسے دیدے جس کے پاس سواری نہیں ہے - اور جس کے پاس ضرورت سے زیادہ زاد راہ ہو تو وہ اسے دیدے جس کے پاس زاد راہ نہیں ہے ۔ اور اس کے بعد آپ نے مال و دولت کی بہت سی اقسام بیان فرمائیں حتیٰ کہ ہمیں نظر آنے لگا کہ ضرورت سے زیادہ کسی چیز میں بھی ہمارا اپنا کوئی حق نہیں ہے ''۔ مجھے عرض

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے دیجئے کہ جب ہم ان دونوں حدیثوں پر غور و فکر کرتے ہیں تو ہمیں نظر آتا ہے کہ حکومت کو یہ حق حاصل ہے (جیسا کہ ہمارے فقہائے کرام نے بھی بیان فرمایا ہے) کہ جب ضرورت مقتضی ہو اور مصلحت عامہ کا مطالبہ ہو تو وہ لوگوں کے ایسے اموال سے جو ان کی اصل اور بنیادی ضرورت سے زیادہ ہو اتنا کچھ لے سکتی ہے جس سے وہ ضرورت اور مصلحت عامہ پوری ہو سکے - اس حدیث سے یہ بات بھی سمجھ میں آ جاتی ہے کہ ضرورت سے زیادہ اموال کی ملکیت کے معنی اسلامی مفہوم میں یہی ہیں کہ وہ اس نوع کی ملکیت ہے جسے حکومت وقت ضرورت اور مصلحت عامہ کے حدود کے ساتھ محدود کر سکتی ہے - البتہ ضرورت اور مصلحت کا اندازہ کرنا حاکم کی خواہشات کے تابع نہیں - بلکہ اس کے لئے ضروری ہے کہ شریعت کے ان مقاصد کی روشنی میں جو شرعی نصوص سے مستنبط ہوں ان کا اندازہ لگایا جائے - اور صرف ضرورت ہی کی حد تک رہا جائے اس سے تجاوز نہ کیا جائے - ہمارے فقہائے کرام نے بھی ان حالات کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جن میں حکومت کو مالداروں کے اموال یا لوگوں سے زائد از ضرورت اموال لے لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے تاکہ ان کے ذریعہ ضروری احتیاج کو رفع کیا جا سکے -

(باقی آئندہ)

و یسئلونك ماذا ینفقون قل العفو

(البقرۃ : ۲۱۹)

اور تم سے پوچھتے ہیں ہم (راہ حق میں) کیا خرچ کریں ؟ ان سے کہہ دو کہ جس قدر (تمہاری ضروریات معیشت سے) فاضل ہو (خرچ کرو) -

---

© rasailojaraid.com